

بحث و نظر

بخدمتِ گرامی! —

(نعیم صدیقی)

اجادہ اقامتِ دینی کے ہر مقدم درینہ مولینا وصی منظر ہندی کے ایک خط کا جواب، جس کا متن درج کرنا اس لیے ضروری نہیں ہے کہ اول تو مذکورہ صاحب کا طرز فکر پہلے سے معلوم ہے، دوسرے میرے جوابات کے پس منظر میں ان کے گرامی نامے کے مندرجات کی جھلک صاف دکھائی دے سکتی ہے!

محترمی و مکرمی جناب وصی منظر صاحب! السلام علیکم

آپ کی توجہ فرمائی کے لیے شکریہ! کہ آپ یا ران کہن کو بھولے نہیں۔ پھر آپ کی اس تحسین کے لیے بھی اقتان جو راقم ناچیز کے لیے پُر زور طریق سے آپ نے فرمائی ہے۔ مگر افسوس ہو کہ اس ساری تحسین کی آخری نوک آپ کا یہ اظہار ہے کہ دیکھا تم بھی انہی باتوں کے قائل ہو گئے، ناں جن کے لیے ہم قافلے سے ٹوٹ کر بہت دور آگئے ہیں!

آپ کے گرامی نامے کا جواب دینا جس جماعت کا کام مخاضہ تو موجود نہیں ہے، میں تو ایک فرد ہوں جس کو اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے متفرق اجاب دکھائی دے جاتے ہیں۔ آپ نے اصل میں جو باتیں کہی ہیں، ان کا مرکزی خیال ایسا ہے کہ بحالات موجودہ زیادہ تفصیل و وضاحت سے بحث کرنا مشکل ہے۔ میں

لے یہاں میں اس بات کی تردید کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے میرے پیش رو بزرگوں نے کبھی پیچھے پٹایا ہو۔ میں از خود آہستہ آہستہ اپنے دائرہ عمل کو اس لیے محدود کرتا رہا ہوں کہ میری صحت زیادہ بوجھ بٹانے کے قابل نہیں رہی، خصوصاً اعصابی نظام لمحات کشمکش میں اپنا پورا حق ادا نہیں کر سکتا۔

آپ کے سوالات کو ایک طرف رکھ کر آپ کے مرکزی خیال کو توجہ کا ہدف بناتا ہوں اور اس سلسلے میں بس کچھ متفرق نکات عرض کروں گا۔ اور امید رکھوں گا کہ آپ سنجیدگی سے ان پر غور کریں گے۔

۱۔ آپ نے اگر مجھ پر اپنے نظریات کی تبلیغ کرنا چاہی ہے تو یہ اس لیے بیکار ہے کہ میں کسی جذباتی سلسلے میں بہتا ہوا نہیں آ رہا، بلکہ پچھلے چالیس برس میں میں نے ضروری چیزیں مسلسل پڑھی بھی ہیں۔ اپنوں اور غیروں سے بحث و اختلاف کا سلسلہ بھی رہا ہے، نت نئے حالات و واقعات کو ایمانی شعور سے زیر غور لاکر ان میں دین کا راستہ تلاش کرنے کے لیے کاوشیں بھی کی ہیں۔ مخالفین کے مخالفانہ حملوں کو بھی جھگٹتا ہے اور برسوں کے رابطے توڑ کر کنارہ کر جانے والے مختلف اصحاب کے طرز فکر اور ان کے رنگارنگ کرداروں کا جائزہ بھی لیا ہے اور ان کو اس حوالہ نصیبی کو بھی دیکھا ہے کہ ان میں سے بعض اتنا کام بھی نہ کر سکے جتنا وہ ہم گنہگاروں کے ساتھ چلنے ہونے کر رہے تھے، بعض وسیع درجے کے کام سے علیحدہ ہو کر کسی محدود قسم کے کام کو لے کے بیٹھ رہے، بعض نے سرے سے "اقامت دین" کا کام ہی چھوڑ کر "اقامت ذات" کو اپنا نصب العین بنایا۔ مجھ ایسے آدمی پر جو فکر و شعور رکھتا ہو اور بعض بظاہر معصوم کنارہ کشوں کی اصل مجبوری سے واقف ہو، اب اس پر آپ تبلیغ کیا کریں گے۔ کبکشاں سے ٹوٹنے والے تاروں کا انجام اس نے دیکھ لیا ہے تو وہ اب کبکشاں سے اور زیادہ ہی چمٹے گا۔

آپ کی ساری تبلیغ کی جان اس طرز عمل نے نکال دی ہے کہ آپ ہم سے کنارہ کرنے والوں کو اپنی نگاہ مقدس سے جس طرح بے عیب دیکھتے ہیں اور ان کی کمزوریاں بلکہ بعض یاوگیاں آپ کو ذرا نہیں کھٹکتیں نہ دوسرے مذہبی گروہوں کے نزدیک اس حال پر آپ کو کوئی احساس ہوتا ہے، لے دے کے ہم گنہگار ہی رہ گئے ہیں جنہیں بہت سے اصحاب نے پہلے درونِ خانہ رہ کر رگیدلا، اور اب بیرونِ خانہ سے بھی عنایات کا سلسلہ جاری رہنا ہے۔

لے میں خود ذاتی طور پر بعض اکابر کے مزکیانہ تجزیوں کا تختہ مشق بنا ہوں، اور اب کیا بتاؤں کہ کئی بے کے حضرات کو خاص خاص موقعوں پر شائستگی کے ادنیٰ تعبیرات سے بھی گرا ہوا پایا۔ مگر سب کچھ ایک مقصد اعلیٰ کے لیے صبر سے جھگٹا اور یہی خیال کیا کہ شاید یہ سب معنی اقامت دین کے تقاضے ہیں۔

۳۔ تبلیغ کے بجائے صحیح صورت افہام و تفہیم کی ہوتی، مگر افہام و تفہیم تو زیادہ تر برابر برابر کے لوگوں میں ہوتی ہے۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ اہل تقویٰ، سرگشتگان کو چہ حق کے لیے "معیطر" بنے جوڑے ہیں۔ اتفاق یہ ہے کہ آپ کا گرامی نامہ مجھے عین اس وقت ملا جبکہ میں نے مولینا منظور رحمانی کی کتاب — ایک ہی دن پہلے منگا کر پڑھنا شروع کی تھی۔ اور کچھ عرصہ پہلے علی میاں کی وہ تنقید مخالفانہ بھی پڑھ چکا ہوں جو "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں" کے خلاف لکھی گئی ہے۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہر طرف سے کچھ حضرات ہماری غلطیاں پکڑنے میں اس طرح لگے ہیں جیسے ماہی گیر مچھلیاں پکڑتے ہیں، مدعا یہ کہ یا تو غلطیوں کو مانو اور ہمارے سامنے سرخم کر دو، یا نہ مانو تو ہم اہل تقویٰ تمہارے خلاف لوگوں کے لوگوں کو شکوک و شبہات سے بھر دیں گے۔ ایسی نارابری میں، جبکہ ایک جانب "تعصب تقویٰ" کام کر رہا ہو، یا "تقویٰ بہت" کا مظاہرہ ہو تو افہام و تفہیم کی فضا کہاں رہی۔

۴۔ ترجمان القرآن میں اپریل تا جون کے اشارات میں جو باتیں میں نے لکھی ہیں، خوب سوچ سمجھ کر لکھی ہیں، اور اس ساری گفتگو کی نوعیت یہ ہے کہ اپنے جاننے والے احباب سے میرا تکلم برادرانہ ہے۔ گویا میں گھر میں بیٹھے کر اپنے خاندان سے باتیں کر رہا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میری باتیں سرگوشی کے طور پر نہیں بلکہ ذرا بلند آہنگی (LOUD THINKING) سے کام لیا گیا ہے۔ اس واسطے کہ گوفی سے میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ خاندان کے باہر کے لوگ بھی جان لیں کہ یہ لوگ زندہ ہیں، جمود زدہ نہیں۔ وہ یگانگت کی ایک ایسی مشینری پر اعتماد رکھتے ہیں جو اپنی درستی خود کرنے والی (SELF REPAIRING) ہو۔ میں اور میرے دوست باہم مدغم مشورے بھی کرتے ہیں۔ آپس میں تنقید بھی کرتے ہیں، احتساب بھی کرتے ہیں، غلطیوں پر بھی نظر ڈالتے ہیں، ان کا اعتراف بھی کرتے ہیں، پھر اصلاح بھی کرتے ہیں۔ ہمیں بسا اوقات آپس میں ایک دوسرے کو تلقین بھی کرنی ہوتی ہے۔ یہ کام بالعموم چپکے سے ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ بھی ضروری ہے کہ کبھی کبھار یہ بلند آہنگی سے بھی ہوں، تاکہ بیرونی عناصر کو معلوم ہو جائے کہ یہ ایسے خادمانِ دین ہیں جو پیری مریدی کے طرز پر کام نہیں کرتے بلکہ نمبر کے مطابق سوالات اور اعتراضات اٹھاتے اور ان کے جواب طے کرنے سے سرگرم عمل ہیں۔ یہ طریقہ فی الحقیقت قرآن ہی کا پیش کردہ ہے جس نے محنت نازک حالات اور طرح طرح کے مخالفین میں گھرے ہوئے مسلمانوں پر غزوہ بدر و احد اور دوسرے غزوات اور خاص خاص واقعات و حوادث

لے عنوان ہے: "مولینا مودودی کے ساتھ میری رفاقت اور اس کی سرگزشت اور اب میرا موقف"

کے بعد بڑی سخت تنقیدیں کی ہیں، اور اس کی پروا نہیں کی گئی ہے کہ دشمن قوتیں کیا کہیں گی اور کیا فائدہ اٹھائیں گی۔ بلکہ قرآن نے تو غالباً خود مخالفین پر بھی یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ ہمارے نوایں اور دین کے تقاضے ایسے بے لاگ ہیں کہ اگر خود اہل ایمان بھی ان کی خلاف ورزی کریں گے تو ہم ٹوکیں گے اور یہ عمل بجائے خود اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بنا۔

اور یہ طریقہ مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی تھا۔ ان کی تقاریر اور ہدایات اور اشارات میں بسا اوقات ”اپنوں“ پر سخت گرفت کی گئی ہے۔ یہی جذبہ میرے اندر کام کر رہا ہے۔

۴۔ پیمپیڈگی یہ ہوئی کہ آپ نے اہل خاندان کی گفتگو گلی سے گذرتے ہوئے سنی۔ اتنے پرکتفا کر لیتے تو مناسب تھا۔ آپ باہر ہی سے بول پڑے اور گفتگو میں حصہ لینا چاہا۔ اور دشواری کو دیا کہ دیکھا تم نے بھی دوسری کچھ مان لیا جو ہم کہتے تھے۔ میں دندن خانہ کے ”اپنوں“ سے بات کر رہا تھا اس لیے میرا انداز کتنا بھی سخت ہوتا اور وہ سخت نہیں ہے) اس کی نوعیت دوسری تھی۔ اور آپ اگر اپنی طرف متوجہ کریں تو پھر انداز مختلف ہونا چاہیے۔ اندر میں صورت میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے مداخلت کر کے میرے مقصد کو نقصان پہنچایا ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات میری گفتگو کو اب غلط معنی میں لیں۔ بنا بریں لازم ہو گیا ہے کہ آپ سے کچھ گزارشات کروں۔

میں آپ کے نوٹس میں یہ ضروری بات لانا چاہتا ہوں کہ آپ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔ میں اس فرق کو واضح کرتا ہوں۔

اقل سے یہ کہ میں اپنے جس حلقہٴ احباب کے ساتھ چل رہا ہوں اس کے ساتھ پورا پورا احسن ظن رکھتا ہوں۔ یہ عنصر بعض کمزوریوں یا وقتی غلطیوں کے باوجود معاشرے کا بہترین عنصر ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے پیشرو آدمی سے لے کر نپس رو آدمی تک بہ حیثیت مجموعی صاف نیت لوگ ہیں اور سب کے سب دین کے غلبہ و استحکام کے تمنائی ہیں۔ انہوں نے نصب العین کبھی تبدیل نہیں کیا، اس کے لیے تمابیر تبدیل ہوتی رہی ہیں اور مختلف اقدامات کا تجربہ کیا جاتا رہا ہے۔ ان تدابیر اور تجربات میں غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں، مگر کسی کا اصل نشانہ غلطیاں کرنا نہیں، بلکہ دین کے مطلوب کو حاصل کرنا ہے۔ آپ کے اندر یہ حسرتیں باقی نہیں، آپ ان لوگوں کو فسادِ نیت اور ترکِ مقصد کا الزام

دیتے ہیں۔

حرف میں یہ کہہ نہیں سکتے جو کچھ سوچتا ہوں دین سے محبت رکھنے والے دوستوں کی بھلائی کے لیے سوچتا ہوں، میں اُن کے درمیان رہنا اور اُن کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔ میرا کوئی ارادہ نہیں کہ اُن کی زجر و توبیخ کر کے اُن سے بھاگ جاؤں، یا پانچپے پڑھا کہ کہوں کہ میری بات مانو ورنہ میں چلا۔ جناب میں واضح رہے کہ ایسے اصلاح پسندوں کی ایک ٹولی بالکل شروع میں، اور ایک ٹولی پاکستان میں عین حالت معرکہ میں کنارہ کش ہو گئی تھی، مگر زجر و توبیخ کر کے ان "واک آؤٹ" کرنے والوں کے غلط طرز عمل سے کسی طرح کا حصولِ غیر نہ ہو سکا۔ دوسروں کی اصلاح تو وہ کیا کرتے، انقطاع کے بعد وہ خود بھی ٹوٹ کر اپنے سابق مشاغل کی طرف چلے گئے۔ اور اقامتِ دین کی جدوجہد تمدنی و اجتماعی دائرے میں زیادہ بہتر طریقے سے تو کیا، کسی کم تر طریقے سے بھی نہ کر سکے۔ میرا طریقہ زجر و توبیخ کا طریقہ نہیں ہے جس کے آگے پھر "واک آؤٹ" ہی کا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے۔ میں اپنے بھائیوں سے پہلے بھی اختلاف کرتا رہا ہوں، اب بھی کہ لیتا ہوں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ تو رہے گا۔ میں اُن پر تنقید بھی کرتا ہوں اور وہ مجھ پر کہ لیتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ لگانگت سے ہوتا ہے اور "اختلافِ امتی رحمتہ" کے مطابق۔ اختلاف سے افتراق پیدا نہیں ہوتا۔

میں اس لیے کہ میرا آپ کا (اور کنارہ کش ہونے والے دوسرے اربابِ علم و تقویٰ کا) ایک فرقہ ہے کہ میں بن سے باقی کر رہا ہوں، اُن میں سے ایک ہوں، اُن جیسا ہوں، اُن سے افضل نہیں ہوں اور ان پر ایمان و تقویٰ کی برتری کا مجھے ذرا بھی زعم نہیں ہے۔ میں اُن کے سامنے اُستاد یا مرشد بن کر نہیں جاتا۔ دوست بن کر جاتا ہوں، انہوں نے تاریخ کے مراحل سے گذرتے ہوئے زخم کھائے ہیں اور مجھے بھی معرکوں

لے ہوتے سامنے کام کرنا نقصان پہنچانے، اور پھر خود بہتر کام کر کے نہ دکھانے کی وجہ سے بیشتر حضرات میں ایک چھپا ہوا احساسِ ندامت موجود ہے جسے وہ غیر شعوری ذہن سے آگے آنے نہیں دیتے، مگر اس کا دباؤ برسوں سے اُن کو بحث و جدل کے چکر میں گولے ہوئے ہے، وہ برابر غلطیاں پکڑنے میں مصروف ہیں اور کہیں جا کر نہ اُن کا اظہارِ اختلافِ مکمل ہوتا ہے اور نہ مغنی جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔ اُلٹا وہ خود غلطیوں پہ غلطیاں کرتے چلے جا رہے ہیں۔

میں چوٹیں لگی ہیں۔ وہ بھی کئی بار گر کر اٹھے ہیں اور میں بھی اپنی تنگ و تاز میں پچھڑ پچھڑ کر آگے بڑھا ہوں۔ اگر میرے مجاہدوں کے تلیوں میں آبلے ہیں تو میرے بھی ٹخنے چھلے ہوئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے محرم اور محب ہیں۔ ان کے زخم میرے زخم، اور میرا درد ان کا درد ہے۔ بیماری کمزوریاں اور غلٹیوں آپس میں مربوط ہیں اور ان کا ازالہ بھی واعظانہ انداز سے نہیں کیا جاسکتا، بل جل کر ہی کیا جاسکتا، ہم ایک دوسرے کی چادر گری کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

ہم ایک دوسرے کے زخموں پر فتوے نہیں لگا سکتے، ایک دوسرے کی چوٹوں کا مذاق نہیں اڑا سکتے ہمارا فلسفہ یہ نہیں کہ جس نے شیطانی قوتوں سے لڑتے ہوئے ان کے ہاتھوں کوئی زخم کھایا ہو یا لڑائی میں کوئی غلطی کر دی ہو وہ قابلِ ملامت آدمی ہے۔ قابلِ ملامت آدمی وہ ہے جو زخم آنے یا غلطی صادر ہونے کے ڈر سے سرے سے "ترکِ ستیز" کر دے۔ آپ حضرات کا راستہ یہی ہے ہم سے الگ جانا ہے۔ کہ چونکہ اقامتِ دین کی سعی میں لغزشیں بھی ہو جاتی ہیں اور چوٹیں بھی کھانی پڑتی ہیں، اور کبھی کوئی غلط بات بھی صادر ہو جاتی ہے، لہذا اس تحریکی سعی ہی کو چھوڑ کر انفرادیت کی کٹیا میں اللہ اللہ کرنا چاہیے جہاں آدمی ہر قسم کی گرد اور آلائش سے پاک ہو کر بیٹھ سکتا ہے۔

فی الوقت یہی دو تین اشارات مکتفی ہوں گے۔ امید ہے کہ اس سے وہ عظیم فرق واضح ہو جائے گا جو ایک ہی طرح کی بات آپ سے اور مجھ سے صادر ہونے میں موجود ہے۔

۵۔ غیر سیاسی دینداری اور تقویٰ جس کا قرون سے دور دورہ رہا ہے، اس کے لیے پہلے تو دین و سیاست کی وحدت کا نظریہ قابلِ مہم نہ تھا، اور اس پر بڑے اعتراضات تھے۔ اسی سلسلے میں تحریک اور نظام اور انقلاب کی اصطلاحات شروع میں دینی طبقے کو غیر دینی محسوس ہوتی تھیں۔ دین و سیاست کی وحدت کا اصول تسلیم ہونے کے معنی اول روز ہی یہ تھے کہ حکومتوں کے بننے اور ٹوٹنے اور قوانین کی تدوین اور نفاذ اور سبٹ اور مالیات کے مسائل سے اہل دین کو دلچسپی یعنی ہوگی۔ دلچسپی بھی اسی حد تک نہیں کہ حلال و حرام بنا دیا۔ اور حالات کو اپنی رفتار پر چلنے دیا، بلکہ حالات کی رو کو متاثر کر کے اسے صحیح سمت موڑنے کی کوشش کرنا لازم ٹھہرا۔ بات یہاں تک آجائے تو پھر باسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ انتخابات سے علیحدہ رہ کر پورا کام کرنا ممکن نہیں ہے۔ آپ پاکستان کو اپنی جگہ رہنے دیں، مصر میں اور ترکیہ میں اور انڈونیشیا اور دوسرے ممالک میں دیکھیں کہ انتخابی عمل کی کیا اہمیت ہے۔

اور دین کا غلبہ چاہنے والوں کا اس عمل سے مقابلہ جاری رکھنا ممکن نہیں ہے۔

آپ کو اعتراضات دو ہیں۔ ایک یہ کہ اس کوشش میں ناکامی ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ اس میں اہل دین کے لیے آلائشیں ہیں۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر سادہ دعوت دین بشکل وعظ گوئی پیش کرتے ہوئے ناکامی یا کم کامیابی پیش آئے تو کیا اس دلیل سے کام کو ترک کر دینا چاہیے کہ کامیابی نہیں ہوتی یا جلد نہیں ہوتی یا کافی نہیں ہوتی۔ اگر یہ درست ہوتا تو حضرت نوح علیہ السلام سال دو سال نہ سہی، تیس چالیس سال ہی دعوتِ حق (جو ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی) کا سلسلہ ترک کر دیتے۔ اصل سوال یہ ہے کہ دین کے غلبے کے لیے ایک کام کو نا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری ہے تو معیار ظاہری کامیابی و ناکامی نہیں ہے۔ سامنے ہی میں یہ کہتا ہوں کہ ان اثرات کو نہ مجھو لیے جو پاکستان کے دستور، اس کے قوانین اور پالیسیوں پر مسلسل پڑتے آ رہے ہیں۔ غلام محمد اور سکندر مرزا کا دور ہو یا ایوب صاحب کا، پیپلز پارٹی کا زمانہ ہو یا موجودہ مارشل لا کا، ہر دور میں دینی تقاضوں کی راہ پر حکومتی پہلو سے پیش قدمی ہوتی ہے۔ اس کا سبب وہ کام ہے جو تحریکِ دستور اسلامی سے لے کر انتخابات ۱۹۷۷ء تک کیا جانا رہا ہے۔ اس مرحلے پر قرارداد مقاصد کا پاس ہونا، بیچ میں قادیانیوں کا اقلیت قرار پانا، ادارہ بعض شرعی قوانین کے اجراء کے ساتھ زکوٰۃ کے نظم کا نفاذ آنکھوں سے دیکھے جانے والے شواہد ہیں کہ یہاں کوئی کام کیا گیا ہے جس کے اثرات رائے عام کی فضا میں موجود ہیں اور جس کی وجہ سے بڑے سے بڑے انحراف پسند بھی مخالف اسلام راستے پر نہیں بڑھ سکا۔ یہ سارا کام اس اثر اندازی کے نتیجے میں ہوا ہے جو انتخاب میں شرکت کر کے، اور فتح پا کر بھی، اور شکستیں کھا کر بھی دینی تحریک پیدا کر سکی ہے۔ سو یہ دنیا جس میں انتخابات بہر حال ہو رہے ہیں، اس میں آپ حکومت سازی کے اس طریق سے انقطاع نہیں کر سکتے۔

پھر ان ناکامیوں کا بھی بس ایک ہی سبب نہیں کہ عوام کو تیار نہیں کیا گیا۔ اگرچہ اس پہلو سے کمی رہ جانے کے اثرات بھی بہت ہوتے ہیں۔ بہت بڑا سبب یہ ہے کہ عالمی سطح پر متحد، سیکولر، مادہ پرست اور اسلام دشمن قوتوں کا ایک گٹھ جوڑ کام کر رہا ہے جو اسلامی تحریکوں کے خلاف عالمی ذرائع ابلاغ، پریس، علمی لٹریچر، ادبی کتب، رسائل و جرائد، اشتہارات، تصاویر، سازشوں، جارحیتوں اور قتل و قتلے کے ذرائع سے کام کر رہا ہے۔ اس کا ایک ہدف یہ ہے کہ کسی ملک میں اسلامی عنصر

کو ابھرنے نہ دیا جائے۔ اس کے لیے پیسہ بھی خرچ کیا جاتا ہے، خفیہ چالیں بھی چلی جاتی ہیں، لوگوں کو آڑ کار بھی بنایا جاتا ہے اور سیکنڈل بھی گھڑے جاتے ہیں۔ باہر والے بڑے تک لے کر لیتے ہیں کہ فلاں پارٹی کو برسرِ اقتدار لانا ہے اور فلاں فلاں اشخاص کو صدر اور وزیر اعظم بنوانا ہے، پھر ان کے متبادل افراد بھی نشان زدہ کر لیے جاتے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ بنگلہ دیش بننے سے پہلے کے انتخابات شدہ میں وہاں کی مضبوط ہندو اقلیت، سیکولرازم کے قائلین، عیسائی، ابا حیت پسند مسلمان سب ایک قطار میں جمع ہو گئے اور ان کا منفی ہدف یہ تھا کہ کسی دینی شخصیت کو ابھرنے نہ دیا جائے۔ چنانچہ مجیب صاحب کی عوامی پارٹی بھرپور طور پر برسرِ اقتدار آگئی اور غلام اعظم صاحب کا گروپ ملک بھر میں دوسری پوزیشن پر رہا۔ یعنی مقابل کا گٹھ جوڑا اگر اُس طرح نہ ہوتا تو نتائج مختلف ہوتے۔ یہی صورت ہمیں پاکستان میں پیش آئی ہے۔ متذکرہ قوتیں جن میں کمیونسٹ اور قادیانی شامل ہوتے ہیں ایک محاذ بنا لیتی ہیں کہ دین کے علمبردار لوگ نہ آئیں بلکہ اُن کے مقابل میں "لا دین مسلمان" نہیں تو کم از کم کمزور مسلمان کامیاب ہوں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ پھر تو کبھی کامیابی ممکن نہیں۔ جی درست، مگر انتہائی بزدلی ہو گی۔ اگر محض اس بنا پر میدانِ مقابلہ کو چھوڑ دیا جائے کہ مخالف اسلام عالمی قوتیں مزاحم ہیں۔ ہیرو لاء کو چیلنج کرنا چاہیے۔ تا آنکہ وہ وقت آجائے کہ اُن کے باندھے ہوئے بند میں شکاف پڑ جائیں۔

اہل ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق

جہ پاؤں اٹھ گئے وہی اُن کے علم ہونے

جناب محترم! جب تک دینِ برسی کے محاذ پر ایک بھی سپاہی طاغوتی قوتوں کو چیلنج کرنے کے لیے موجود ہے۔ اس وقت تک شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس دن معرکہ آرائی کے میدان میں کوئی علمبردارِ اسلام نہ رہا۔ اُس دن چاہے انفرادیت کی خانقاہ کتنی ہی آباد ہو، تمدنی قوت کے لحاظ سے ملتِ شکست خوردہ ہو گی۔

ہمارا کوشش یہ ہے کہ یہ نبرد جاری رہے اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق ہم دو کو تین سے اور تین کو چار سے لڑانے کے لیے اٹھے ہیں۔ مگر لڑائی حق کی لڑائی ہے۔

۶۔ اب لیجیے انتخابات میں دینی کوتاہیوں یا اخلاقی لغزشوں کا معاملہ!

ہم لوگ سیاست کے بالکل نئے دائرہ کار میں کام کرنے نکلے ہیں جہاں قریبی دور کے اہل تقویٰ نے بہت کم نقوش چھوڑے ہیں۔ خصوصاً انتخابات کا میدان تو ایسا ہے جس میں خالص دینی جذبے سے کوئی معرکہ لڑا ہی نہیں گیا۔ یہ میدان جس میں غلط قوتوں نے عرصہ دراز سے گندگی پھیل رکھی ہے، اس میں اگر ہم آویزش کے لیے نکلے ہیں تو کچھ عجب نہیں کہ آلائشوں سے ہمیں سابقہ پیش آئے مصیبت محض آلائشوں کا ہونا نہیں، بلکہ مصیبت تو یہ ہوگی کہ دینی لوگ آلائشوں کو آلائشیں نہ سمجھیں بلکہ دامنِ نیت سمجھیں۔ پھر آپس میں وہ لوگ ایک دوسرے کو توجہ دلانے والے بھی نہ ہوں کہ بھئی کچھ آلائشیں ہمارے دامن و آستین پر لگ گئی ہیں۔ آؤ انہیں صاف کر لیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی ہمارے دامن آلائشوں کو آلائشیں سمجھا اور محسوس کیا جاتا ہے اور محسوس کرایا جاتا ہے اور لوگ ان سے نجات پانے کی فکر کرتے ہیں۔

لیکن وہ صاحبِ تقویٰ جو محض اس بنا پر سیاسی و انتخابی آویزشوں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے کہ یہاں آلائشوں کا بھی خطرہ ہے، اس کا بے آلائش رہنا اسے آخر دی باز پرس سے نہ بچا سکے گا۔ ٹھیک ہے یہاں کچھ پھیلی ہوئی ہے، ٹھیک ہے یہاں گوبر ہے۔ ٹھیک ہے یہاں سڑا ہوا پانی ہے، مگر میدان کا رزار یہی ہے۔ معرکہ بھی لڑیے اور اسے صاف کرنے کی سعی بھی کیجیے اور اپنے آپ کو ہر بار پاکیزگی کے معیار پر بھی لائیے۔

یہ سوچنا کہ کوئی ایسا غیر انتخابی یا انتخابی نظام بن جائے جس میں چند خواص کو ووٹر بننے کا حق ہو، میرے نزدیک ایک بیکار خیال آرائی ہے۔ آخر کسی ملک کی اکثریت، جس میں غیر مسلم بھی ہوں اور بگڑے ہوئے یا غافل مسلمان بھی، یہ قربانی کیوں دے کہ وہ ایک اقلیتی گروہ کو سارا اقتدار سونپ کر خود قسم کی سیاسی دخل اندازی سے کن رہ کش ہو جائے، بالکل غیر ممکن بات ہے۔ کسی جبری یا جذباتی کیفیت میں قلیل مدت کے لیے ایسا ہو سکتا ہے، مگر یہ کوئی مستقل راہ عمل نہیں ہے۔ جو اصحاب یہ سمجھتے ہیں

اے کچھ تازہ تجربات آپ کو "میٹر" بننے کے بعد بھی ہوتے ہوں گے۔ سوچنے کا ایک پہلو یہی نہیں کہ آپ کی تباہی چھیننے کیسے کیسے پڑتے ہیں۔ توجہ طلب تلخ حقیقت یہ ہے کہ بڑائی کس دور سے اٹھ رہی ہے اور کیا جراتیں دکھا رہی ہے، کیونکہ اسے روشنی دینی کی کسی قوت نے پہلے چیلنج نہیں کیا تھا۔

کہ وہ اکثریت کے اندر رضا کارانہ جذبات پیدا کر سکے اس قربانی کے لیے آمادہ کر لیں گے، اُن سے عرض ہے کہ پھر وہ اسلام کے مبادیاتی تقاضوں ہی کے لیے ان میں رضا کارانہ جذبات پیدا کر دیں، باقی مراحل درست ہو جائیں گے۔

یہ درست کہ کسی بگڑے ہوئے معاشرے میں راستے وہی بالغاں کا طریقہ آسانی سے مطلوبہ نتیجہ نہیں دے سکتا، خصوصاً جب کہ اندر اور باہر کی قوتیں اس میں طرح طرح سے خلل اندازی کرتی رہتی ہوں مگر مجبوری یہ ہے کہ سوائے اس کے سیاسی عمل کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

البتہ یہ الگ بات ہے کہ اسلامی انقلاب کا تکمیلی ظہور ضروری نہیں کہ انتخابات ہی کے ذریعے ہو۔ اور بھی راستے ہیں جن سے انقلاب تک ظہور پاتے ہیں اور پیشتر سے کوئی نہیں جانتا کہ کس ملک میں کب کیا ہوگا۔ اصل چیز یہ مطلوب ہے کہ سیاسی عمل جاری رہے، اس میں اہل دین اثر انداز ہوں اور یہی اثر اندازی بڑھتے بڑھتے آخری مرحلے میں اپنے نتائج دکھائے۔

۷۔ انتخابات محض قومی انتخابات ہی نہیں ہوتے، یونیورسٹیوں میں، مزدوروں میں مختلف پیشوں کے کارکنوں میں یونین ازم موجود ہوتا ہے، اور اُن کے لیے بھی انتخابات ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی انتخابی عمل ہر شعبہ زندگی میں پھیلا ہوا ہے۔ ان سارے شعبوں میں شرکت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اگر پاکستان کے اسلام پسند طلبہ منظم نہ ہوتے ہوتے اور انہوں نے سرخ عناصر کو انتخابی میدان میں کبھی چیلنج نہ کیا ہوتا تو آج ہر طرف کمیونسٹوں کا غلبہ ہوتا جس کے محض قسطنطین سے آپ کی آئندہ فلسوں کا رخ بدل جاتا۔ آج آپ اسلامی جمیعت طلبہ میں کتنی ہی کوتاہیاں تلاش کر دکھائیں، اسی کے دم سے آپ کی تعلیم گاہوں میں اسلامی رجحانات کے لیے مواقع موجود ہیں۔

ایک دور وہ تھا کہ معاشرے میں صرف حکومت کا ادارہ منظم ہوتا تھا، اب نئے سے نئے منظم ادارات وجود میں آگئے ہیں۔ اور ہر ادارہ اپنی انفرادی وسعت اور تنظیمی قوت کے لحاظ سے سیاست و معیشت میں مؤثر پارٹ ادا کرتا ہے۔ یہ ادارے سیاسی ہوں یا غیر سیاسی، ملے جلے اٹھاتے ہیں۔ ریزولوشن پاس کرتے ہیں، جلسے کرتے ہیں، پریس کانفرنسیں بلواتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں، مظاہرے کراتے ہیں، ہڑتالیں اور بھوک ہڑتالیں کراتے ہیں، اور ان مختلف تدبیروں سے حکومت یا سربراہ دار طبقے یا سیاسی جماعتوں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔

کیا آپ جدید دور کے تمام منظمات سے قطع نظر کر لیں گے، ان کے اندر کام کرنے کی راہیں نہیں نکالیں گے؟ ان کے اندرونی انتخابات سے دلچسپی نہیں لیں گے اور ان کے پروگراموں اور منصوبوں کو غلط رخ سے ہٹانے کی مساعی نہیں کریں گے؟

جی ہاں، معروف دینداری اور علماء کے ٹکسالی تقویٰ کو معاشرے کے سمندر کی ان ساری موجوں اور روروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ جدھر سے جا ہیں اٹھیں اور جس طرف جا ہیں چلی جائیں، اور جس شے کو چاہیں لپیٹ میں لے لیں۔ سکہ بند دینی رسائل میں غلط بنیادوں پر قائم ہو کر معاشرے کو بگاڑنے والے منظمات پر اس نقطہ نظر سے کبھی کوئی بحث میں نہیں دیکھی کہ اگر ہم غلط منظمات پر قابو نہیں پاسکتے تو صحیح تر منظمات کو خود وجود دیا جائے جو ایک جوانی طوفان کی حیثیت سے تخریبی طوفان کو روک دیں۔ جی نہیں، مجھلا یہ مسائل و معاملات دینی بحثوں کا موضوع کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ تو دنیا داری کی باتیں ہیں اور باطل کے مشغلے!

مگر خوب سمجھ لیجیے کہ موجودہ دنیا میں مختلف نوع کے خفیہ اور ظاہری ادارے اور منظمات نہ صرف قوموں کی حد تک بلکہ بین الاقوامی سطح پر موجود ہیں اور ان سے مسلمانوں کا بے تعلق رہنا ممکن نہیں رہا ہے۔ آپ ایک انتخابی قضیے پر اچھے بیٹھے ہیں، آج کے معاشروں میں تو ادھر بہت کچھ محاذ آرائیاں ہو چکی ہیں ان سے تعرض کیجیے تو طرح طرح کی الجھنیں پیش آتی ہیں اور جگہ جگہ آلودگیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پھر کیا متقی ہی ہو گا کہ ان سارے جھگڑوں منٹوں کو چھوڑ کر مدارس کے مصلوں، مساجد کے منبروں اور مکتبوں کے موزوں پر بیٹھ کر دین کی خدمت کی جائے اور کچھ تبلیغی دورے کر لیے جائیں۔

یہی یہ نہیں کہتا کہ نئے دور کی اجتماعیت کے پیمپدہ دائروں میں کام کرتے ہوئے ضرور غلطیاں کی جائیں گی یہ کہتا ہوں کہ یہ میدان ہائے کار ایسے صعب و دشوار ہیں، نیز ان کے متعلق اہل تقویٰ کے پہلے سے تجربات موجود نہیں ہیں، اس وجہ سے جو نئے لوگ کام کرنے آتے ہیں وہ بار بار لغزشیں کھلتے ہیں۔ آپ اگر اجتماعیت کے جدید پیمپدہ دائروں میں لغزشوں کے بغیر کام کرنے کا کوئی مشاہدہ کرادیں تو سب سے پہلے میں آپ کا فقدان ہوں گا اور یہ سمجھوں گا کہ اجتماعیت کے جنگل میں سے ان بزرگ نے خدمتِ اسلام کا ایک اہم راستہ نکالا۔ تاریخ پر یہ بڑا احسان ہو گا۔

۸۔ اوپر کے اشارہ نمبر میں جو گفتگو ہوئی ہے اسے ذرا سا اور آگے بڑھائیں تو بے حد تشویشناک

صورتِ حالات سامنے آتی ہے۔

ہمارے اس دور میں انسانی تمدن و معاشرے کے ڈھانچے کو بعض نئے احوال نے اس درجہ مسخ کر دیا ہے کہ اس ڈھانچے میں کام کرنے والوں کے لیے آئندہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا کہ ایک خاص قسم کے حالات میں کیا حق ہے اور کیا باطل، تقویٰ کی راہ کدھر سے جا رہی ہے اور فتنہ کی کدھر۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

ہسپتال اس دور میں ایک نئی شکل اختیار کر چکی ہے۔ بسا اوقات ہسپتالیں اتنی وسیع الاثر اور طویل ہوتی ہیں کہ حکومتیں معطل ہو جاتی ہیں، وزارتیں جھک جاتی ہیں اور نئے دستوری و قانونی فیصلے کرنے یا پالیسیوں کو بدلنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہسپتال جائز ہے؟ آپ کی نظر میں ناجائز اگر ہے تو وہ تو مسلمانوں کے لیے ہو سکے گی، لیکن اگر ہسپتال کو اسلامی ماحول ہی کو دہانے کے لیے استعمال کیا جائے تو کیا تقویٰ ہوگا؟ ہسپتال کیسے والوں کا حکم کیا ہے اور ہسپتال کے آگے ٹھکنے والی حکومت یا سرمایہ دار قوت یا کسی سیاسی پارٹی پر کیا حکم لگے گا؟ کیا ہسپتال کی قوت کو مسلمان بھی غیر اسلامی رجحانات و اقدار کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں؟ اگر کر سکتے ہیں تو پھر اس کے کچھ تفصیلی متعلقات بھی ہیں۔ ہسپتال کے لیے ہجومی قوت کا لزوم، اس میں نعرہ بازی ہسپتال کو ناکام بنانے والوں کے متعلق روٹیہ وغیرہ۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ نہ تو ہماری فقہ میں ہسپتال کا کوئی باب ہے، نہ اس سلسلے میں نئے دور کے عالموں نے کوئی فتاویٰ جاری کیے ہیں، نہ اربابِ اقلاد ایسے کسی ہنگامے سے موافقانہ یا مخالفانہ تعلق رکھتے ہوئے آسانی سے ہر جنبیٰ الجھن میں حکم لگا سکتے ہیں کہ تقویٰ کا وزن کس طرف جانا چاہیے یا کس طریق پر چلنے سے تقویٰ بڑھے گا!

اسی طرح اس دور میں ایک ناپسندیدہ کردار چھاپہ ماروں کا ہے۔ بلیک ستمبر اور بلیک ڈسمبر جیسی سخریوں کے نامور کردہ افراد کسی ممتاز شخصیت یا طیارے پر جب قبضہ کر لیتے ہیں تو جب تک وہ ناکامی سے دوچار نہ ہو جائیں متعلقہ حکومت کا حاکمانہ اقتدار اور ملکی دستور سب کچھ دو تین افراد کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے مطالبات منواتے ہیں کہ فلاں مجرموں کو رہا کر دیا جائے، اتنی رقم فراہم کی جائے، فلاں سام گاہ پہنچنے کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے، اور یہ چھاپہ مار بھی ایک خاص صورتِ حالات

کے پیدا کردہ ہیں۔ مثال کے طور پر اہل فلسطین کو لیٹھے جنہیں ان کے وطن سے سب کچھ چھین کر نکال دیا گیا اور جو رہ گئے ہیں وہ انسانی حقوق سے محروم ہیں اور جو جیلوں میں جاتے ہیں وہ خوفناک اذیتیں بھگتتے ہیں۔ ان حالات سے کوئی راہ نجات نہیں۔ بے بسی کی بس کیفیت نے بچا پر مار تھر کیوں کو ظہور دیا اور انہوں نے دباؤ ڈالنے کے نئے طریقے نکالے۔ اپنے لوگوں کو ناروا ظلم کے پیکر سے نکلانے کے لیے بے بس لوگوں نے یہ راستہ ٹھونڈا۔ دوسری جگہ پر بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

اب جز بہ جز اس معاملے میں حکم لگا کر دیکھیے کہ کیا پیر کہاں تک جاتا اور کیا صورت کہاں تک ناجائز ہے۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ مختلف سوچنے والوں کی راہیں ایسے مسائل میں مختلف ہوں گی۔

اب آپ ذرا ترکی کے حالات پر نظر ڈالیں۔ وہاں کے کمیونسٹ جن کی بحصر قی زیادہ تر مسلمانوں کے ایک اقلیتی گروہ سے ہو رہی ہے، روس کی پشت پناہی سے ترکی میں اسلامی تحریک کو ناکام بنانے کے لیے دابیں بازو کی مؤثر شخصیتوں کو قتل کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔ اب ایک شکل یہ ہے کہ دوسری جانب کے اکثریتی مسلمان جو با کچھ نہ کریں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ قتل کے ذریعے مخالف اسلام سیاسی انقلابی انگیزی کی اس کوشش کو ناکام بنانے کے لیے مخالف معاذکی جڑیں بھی کاٹیں۔ میں نہیں کہتا کہ وہ طریقہ درست ہے یا بیسیع۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ ان پیچیدہ حالات میں حکم لگانا آسان نہیں۔ زیادہ بہتر طور پر وہی لوگ سوچ سمجھ سکتے ہیں جو ایک صورت حالات سے عملاً دوچار ہیں۔

ایک تجربہ شام میں اخوان کا ہے۔ شام کی مسلم دشمن نصیری اقلیت (جو مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں اور کیونیونٹوں سے زیادہ قربت رکھتی ہے) کی جابرانہ حکومت کے خلاف اہل سنت کی اکثریت میں شدید اضطراب ہے۔ اخوان بہر حال اہل سنت کے حامی ہیں۔ چونکہ یہ ایک منظم قوت ہے لہذا حکومت نے اسے کچلنے کے لیے قتل معاذ کے سلسلہ شروع کیا۔ اور جھوٹے الزامات میں ان کے بڑے بڑے گروہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک شکل یہ ہے کہ اخوان اور اہل سنت دونوں مسلم دشمن جابر اقلیت کے مہضوں خوش خوشی حوالہ موت ہوتے رہیں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ ایسی بے حس و حرکت قربانی کے بجائے وہ جو اباً ظالم قوت کو ضرب لگائیں۔ وہاں دوسری صورت اختیار کی گئی ہے۔ فرمائیے کہ فقہاء اور اتقیاء کیا حکم لگائیں گے۔ اسی طرح ایک صورت حالات ایران میں ہے، ایک آسام میں ہے، ایک افغانستان میں ہے۔ ان جگہوں پر جو واقعات ہو رہے ہیں، ان کا تجزیہ کر کے ہر چیز پر ایک حکم لگانا آسان نہیں رہا۔

اس کے لیے ایک نئی فکری درکار ہے جو نصوص کو برقرار رکھ کر ان کے اجتہادی انطباقات کو نئی شکل دے۔ ان مختلف حالات سے گزرنے کے لیے ایک نیا احساسِ تقویٰ درکار ہے جو طرح طرح کے لوگ کے احوال و مشورے سے گزرتے ہوئے بھی انسان کو اس طرح اطمینان دے سکے جیسے وہ خانقاہی ذکر و دعا میں اور تبلیغ و تدریس اور افتاء کے کاموں میں دیتا رہا ہے۔

یہ بڑے بڑے معاملات جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور جن کے اندر سے دنیا کی بڑی بڑی اسلامی تحریکات گزر رہی ہیں، آپ جب ان پر غور کریں گے اور ان پر حکم لگانے کی کوشش کریں گے تو آپ کو چھوٹے درجے کی انتخابی الجھنیں مجھول جائیں گی۔

میرا مقصد یہ نہیں کہ پیچیدہ دائرے ہوں یا سادہ انتخابی دائرہ، کسی بھی جگہ خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کی جائے اور ہم نوجوان مسلمانوں کو یہ حوصلہ دلا دیں کہ وہ جو چاہیں کریں۔ خدا کی پناہ، ایسے کسی تصور سے! میرا مطلوب صرف یہ بات ہے کہ اب تک جو سگہ بند تصورات چلے آ رہے تھے، اب ان سے زیادہ وسیع تصورات کی ضرورت ہے اور وسعتِ نظر اور عالی ظرفی سے، بدلتی ہوئی دنیا کے احوال کی پیچیدگیوں کو دیکھنا چاہیے۔ تبھی ہم یا ہمارے علماء اس قابل ہو سکیں گے کہ نصوص کے بہتر منطوق اور انطباقات سامنے لاسکیں اور تقویٰ کا زیادہ گہرا اور زیادہ بسیط تصور دلا سکیں۔

حال اور مستقبل کی تاریخ کی یہ وسعتِ آفاق ہمارے سامنے ہے۔ اور ہم کو نشان ہیں کہ نئی نسل غلبہٴ اسلام کی کشمکش سے عہدہ برآ ہونے اور انتہائی پیچیدہ اور نادیدہ حالات میں خدا خوفی سے صحیح حکم لگانے اور اس کی پابندی کرنے کے لیے تیار ہو سکے۔

براہ کرم ہمارے تصوروں اور کوتاہیوں کا حساب لگانے اور پھر ہم سے نفرت کرنے کے بجائے پیش آمدہ بھاری ذمہ داریوں اور مشکل مراحل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہماری کادشوں اور فکر مندوں اور مساعی کو دیکھ کر ہمیں لگاؤ و شفقت و رحم سے بھی دیکھیے۔ ہم طوفانِ زدگان کے سامنے روایتی سبکارانِ ساحل والا معاملہ نہ کیجیے۔

۹ — مولانا مودودی اور ان کے متاثرین کی جتنی بھی غلطیاں کوئی پکڑنا اور اچھاتا رہے، ان کا کیا ہوا اصل بڑا کام ایسا ہے کہ اس سے بڑی کوئی نیکی اس پاس مجھے دکھائی نہیں دیتی۔ انہوں نے دعوتِ دین کو اس انداز سے پیش کیا کہ ایک طرف مغربِ زندگی کا طلسم ٹوٹنے لگا اور

دوسری طرف جاہل مذہبیت سے آگے تخریب کی تصورِ اسلام کی راہیں واضح ہوئیں۔ نتیجہ یہ کہ بے شمار لوگ متاثر ہوئے، متحرک ہوئے، ذہن دکروار کے لحاظ سے تبدیل ہوئے۔ جو نسل ان کے دورِ شباب میں اٹھ رہی تھی پہلے وہ کچھ کر آئی۔ بعد میں موجودہ دور کی زیرِ تعلیم نئی نسل فسق و فجور کے ماحول اور آمریت و فتنہ گری کے طوفان کے باوجود دینِ حق کی راہ پر گامزن ہو رہی ہے۔

آپ کو تو ضرور اس کا اندازہ ہو گا کہ موڈ و ری صاحب نے متاثرین نے کتنی قربانیاں دی ہیں اور کتنی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔ آج بھی یہ عناصر قبولِ حق، ترکِ مفاد، تحملِ شائبہ، مالی ایثار اور فروغِ دعوت کے لیے جان ماری کے لحاظ سے ایک اچھی مثال پیش کر رہے ہیں۔ ان کی نگاہیں اتنی وسیع ہیں کہ وہ نہ صرف اپنے قریبی معاشرے میں اٹھنے والے ہر فتنے کو محسوس کر لیتے رہے اور ہر متحرک شخصیت اور گروہ کے مقام کا اندازہ کر لیتے رہے ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی مختلف قوموں، تحریکوں، نظریات، اداروں، سازشوں اور فتنوں کی شناخت کرنے کے اہل ہیں۔ بات صرف علم و شناخت تک ہی محدود نہیں، وہ غلط عوامل اور محرکات کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان کا ایک مستقل محاذِ مخالفِ اسلام تحریکوں کے خلاف ملک ملک میں کام کر رہا ہے۔ اسی متحرک مجاہدانہ قوت کے پاس لڑائی کی قوت ہے تنظیمی قوت ہے، اس کے جا بجا مختلف انداز کے ادارات ہیں، اور یہ سب کچھ پورے عالمِ اسلام کے لیے سرمایہٴ افتخار ہے۔

تنت کا یہ ایسا اگلا مورچہ ہے کہ جس کی جانفشانیوں کی وجہ سے پیچھے کے تمام مذہبی حلقوں اور گروہوں اور اداروں کو زیادہ قدر و قیمت حاصل ہے۔ قدر و قیمت ہی نہیں، تحفظ بھی حاصل ہے مخالفِ اسلام عالمی قوتیں اور ملکی حکومتیں ہمیشہ اگلے مورچے پر پوری رش کرتی ہیں، جس پر متحرک سپاہی مہم جو ہیں۔ اس اگلے مورچے پر اگر پیچھے سے شہزاد مارے جائیں گے تو پھر براہِ راست ہر مذہبی دار اور گروہ زدہ ہیں آئے گا۔

پس قدر کیسے اس دینی فکر اور عملی تحریک کی جس کی وجہ سے امت کی نگاہیں ایک روشن نصب العین پر مرکوز ہوئی ہیں اور نوجوانوں میں حالات کی سنگینی کے باوجود آمین اور عزم و حوصلہ ہے۔ اگر بار بار اگلے مورچے کے افراد کو آپ بے دینی اور انحراف اور عدم تقویٰ کے طعنے دیتے رہیں گے تو امت کی امیدوں اور حوصلوں کو کچل دینے کا سبب بنیں گے۔ کبھی نیتوں پر حملہ، کبھی یہ الزام کہ مقصد بدل گیا

ہے یا مزاج بدل گیا ہے، کبھی یہ بحث کہ دینی تحریک سیاست زدہ ہو گئی ہے، کبھی یہ نزاع کہ انتخابات کی شرکت اخلاقی زوال کا باعث ہے اور اس کے ذریعے حاصل کچھ نہیں ہوگا، مغز نیکہ اقامت دین کے لیے سعی کرتے ہوئے نوجوانوں کو الجھنوں میں ڈالنے اور عوام میں ایک اچھے مصلحے کام کے خلاف شکوک و شبہات کے بیج بونے سے کوئی خدمت اسلام تو ہو نہیں سکتی۔ کسی بھی شخص یا گروہ یا ادارے کا ناپ تول کرنا ہو تو دیانت داری سے اس کی خدمات اور اس کی کوتاہیوں یا لغزشوں کو میزان عدل کے دونوں پلٹروں پر رکھیے اور پھر بتائیے کہ پلٹا کدھر جھکتا ہے، ورنہ یہ طرز فکر تو منصفانہ نہیں۔ ع۔

کہ عالمگیر منہد کش تھا، ظالم تھا، مسترگ تھا۔

۱۰۔ ہماری اور دوسروں کی ہزار لغزشوں اور کوتاہیوں سے بڑا گناہ امت محمدیہ میں افتراق پیدا کرنا ہے۔ یہ دور جبکہ معاند قوتیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متحد ہو کر ہر تدبیر و اقدام اختیار کر رہی ہیں۔ اس میں مسلم گروہوں کا ایک دوسرے کے خلاف جملے دل کے پھینچوٹے پھوڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہونا علامتِ غیر نہیں۔ آج تو پانی گلے گلے آچکا ہے۔ مخالف قوتیں مسلمانوں کے اُبھار کر روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہتی ہیں۔ فلپائن، اریٹریا، فلسطین، اوگاڈین، افغانستان، آسام اور کشمیر میں مسلم دشمن قوتیں ہر قسم کے مظالم توڑ رہی ہیں۔ ایسے میں تو چاہیے تھا کہ ہمارے تمام گروہوں کے اکابر مل بیٹھتے اور طے کرتے کہ آپس کی معرکہ آرائیاں ختم، اب ساری قوت اسلام دشمن اور مسلم دشمن قوتوں کے خلاف متحد ہو کر صرف کی جلتے گی۔ اس کے لیے نہ تو اہل علم کاوش فرما رہے ہیں اور نہ اہل تقویٰ کوئی کوشش کر رہے ہیں۔ بلکہ اُلٹا جو قوت پیش پیش ہو کر معرکہ آرا ہے، اسی کی پیٹھ میں غنچہ گھونپنے کے لیے نیک لوگ کوشاں ہیں۔

کہ سارا تقویٰ اسی کارنامے میں رکھا ہو۔

ذرا بنگہ دیش بننے سے پہلے کے واقعات کی یاد تازہ کیجیے۔ آخری مرحلوہ تھا جب کہ کمیونسٹ، ہندو، سیکولر مزاج کے مسلمان بھارتی حکومت اور فریج کی پشت پناہی سے دینی قوتوں کو تباہ کرنے کے لیے میدان میں اتر گئے تھے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ایک دینی قوت اور ایک سیاسی قوت آگے بڑھی، بقید اہل دین کنارہ کش رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب مخالفوں کے چپڑے اور گولیاں حرکت میں آئیں تو انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ کون نعیمِ مدیقی اور کون وحی منظر ہے بلکہ صرف یہ دیکھا کہ دینی مزاج کا آدمی کون ہے اور دینی کام میں کون کون نمایاں ہے۔ نہ اس پورے شے سے تبلیغی جماعت کے

حضرات نیچے، ان کو ٹی امام مسجد اور مؤذن — اِلا یہ کہ کسی نے یا تو دوسروں سے مل کر جوابی محاذ آرائی کی ہو یا فرار کا راستہ نکال لیا ہو۔

یہی کہتا ہوں کہ اگر یہی متفرق دینی قوتیں متحد ہوتیں تو چاہے وہ معرکہ آرائی میں مٹ جائیں مگر مخالف دینی قوت کو وہ سبق سکھا دیتیں کہ پھر کبھی ایسی جرأت نہ ہوتی۔

یہ تو ہے ماضی کی بات جس نے حسرت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ سوچنا چاہیے مستقبل کے متعلق کہ آیا حوادث کے نشے ریلوں کا مقابلہ شانِ افتراق کے ساتھ کرنا ہے یا متحد قوت بن کر۔ اگر اتحاد کی دینی اہمیت سمجھ میں آسکے تو اس کا اصل الاسول یہ ہے کہ ایمانیات میں جو عناصر کوئی بنیادی اختلاف نہیں کرتے ہیں۔ اور نہ ضروریات دین میں سے کسی کے منکر ہیں ان کو مسلم سمجھ کر بات کی جلتے اور عبارتوں اور لفظوں کی پیچھے چھڑ کر کے خواہ مخواہ کے الزامات ان پر نہ چپکائے جائیں۔ جماعتیں ادارے، مدرسے، فقہی تصورات اور معیارات تقویٰ الگ الگ رکھ کر بھی آپ دفاعِ ملت ادا قامت دین کے کام میں جتنا جتنا ممکن ہو تعاون کر سکتے ہیں۔ کسی جہز میں آپ تعاون نہ کر سکیں تو نہ سہی، لیکن من حیث المجموع جادہ سخی پر ہمدرد ہو کر چلنا چاہیے۔ یہ نہیں تو پھر دوچار جزیرہ ٹائٹے تقویٰ کے علامہ اسلام صرف وہاں ملے گا جہاں جزیروں کے ٹاکوں کی مہر کردہ دستاویز پہنچے گی۔ پھر اپنے سوا سب کی کھل کر تکفیر کیجیے تاکہ اس مشغلے کے نتائج بھی بھرپور طور پر آپ کو ملیں۔ اگر دونوں میں نفرتوں کی بجائے بھری ہوئی ہو، کبر و تکبر و زہد و ذہن پر مسلط ہو تو پھر اتحاد بین المسلمین کا کام ہو چکا۔

یہی اپیل کرتا ہوں کہ ہم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابل میں حسد یا کبر کے جذبات نہیں رکھنے چاہیں، ہم سب مسلمان ہیں، ہمارا مقصد غلبۂ اسلام ہے اور ہم مخالفِ اسلام عالمی محاذ کا مقابلہ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

امید ہے کہ میرا طرزِ فکر ان گذارشات سے واضح ہو گیا ہو گا۔

”اشارات“ میں جو بحث آ رہا ہے وہ ایک پہلو کی بات ہے، اور آپ نے جو قضیہ اٹھایا ہے، وہ اس کے برعکس دوسرے پہلو سے متعلق ہے۔ ان دونوں دائروں میں جو خیانات ہیں دسے رہے ہوں، ان کو باہم دگر دگر کرنا یا نہ جاڑے بلکہ ان کو ہم آہنگ کر کے پڑھا جائے۔ ایک طرف میری گفتگو یہ ہے کہ دین کے اصولوں و اخلاق کی قدروں کو غالب رہنا چاہیے اور بنیادی دعوتِ اسلامی کے کام کو مستقلاً اہمیت دینی

زبان شہزادہ کی سب سے گہرا سہم نام ہے۔ وہ اسے پیسے سے اور عجا
 کاترک درست نہیں ہے۔ نیز جو بھید گیاں دینداری اور انتخابی سیاست کو اکٹھا کرنے سے پہلے
 اور اس کے بعد اس کے لئے تمام قوتوں معاشرہ کے لئے اس کے لئے نہ پیدا کیے
 میں سے اس کے لئے ایک دوسری گتھیں کرتی ہیں۔



لے ایک اور صاحب نے اشاعتی میدان میں گھی کا پراجہ بنایا ہے۔ مگر ان پراجوں میں روشنی نہ رہے گا۔